شاہ عبداللطیف بھٹائی کا سماجی شعور

ڈاکٹر حاکم علی برڑو[1]، محمد زبیر**

Abstract:

"Man is a social animal and Poets are also an integral part of society. Although our Mystic poets preaches brotherhoods, peace and kindness through their poetry but a deep study of their poetry depicts that they have presented the social, cultural and political conditions of their times in a realistic manner. Shah Abdul Latif Bhittai is a great mystic poet of Sindhi Languages has also painted the society of his times neutrally. He portrayed land lords, farmers, saints and Rulers of his age in his poetry. His characterization and imagery is commendable. This research article will explore the presentation of his age in his poetry by appropriate examples."

شاہ عبداللطیف بھٹائی 1689ء میں بھٹ شاہ میں پیدا ہوئے اور 1752ء میں وفات پائی۔ شاہ صاحب کا شمار صفِ اول کے شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کی شاعری سندھی سماج اور تہذیب کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ شاہ لطیف کے لیے یہ بات عام ہے کہ لطیف سندھ ہے اور سندھ لطیف ہے۔ مطلب سندھ کو سمجھنا ہے تو شاہ لطیف کی شاعری کو سمجھنا ہوگا اور اگر شاہ لطیف کے شاعری کو سمجھیں گے تو سندھ اور سندھی سماج کو سمجھیں گے یعنی شاہ لطیف نے اپنی شاعری میں سندھی سماج کا پورا عکس بیان کیا ہے۔

شاہ لطیف کے زمانے میں سندھ کے سماجی حالات کس قسم کے تھے؟ اس سوال کا قابل اطمینان جواب تو ہمیں شاہ کے کلام سے بھی مل سکتا ہے۔ لیکن شاعرانہ انداز بیان اور غیر مربوط سماجی عوامل کو یکجا کرنا کافی حد تک دشوار ہے۔ دشوار اس لیے کہ شاہ کو اس دور کے سماجی حالات نے وقتاً فوقتاً جس طرح متاثر کیا اور اس تاثر کو شاہ کے قلب و نظر نے شاعرانہ طور پر جس جس طریقے سے خارجی و داخلی محرکات کا اثقال سمجھا، اس کا سراغ لگانا بذاتِ خود ایک قسم کا تخلیقی کام ہے۔ یہ عمل بالکل اسی قسم کا ہے جیسے کوئی شخص بیچ تلاب میں کھڑا ہو کر چھوٹی بڑی پھیلتی ہوئی لہروں کو سمیٹنے کی کوشش کرے۔

ڈاکٹر سورلے نے سندھ کی سماجی زندگی کی نوعیت بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

> "The life of Sindh was like a pool into which from gine to time a pebble is thrown from contside. There are few ripples after the splash and then all is still one more"**(1)**

ڈاکٹر سورلے نے یہ بات سندھ کی اس سماجی زندگی کے متعلق کہی ہے، جو شاہ کے زمانے سے عبارت ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سندھ میں سلاطین مغلیہ کا اقبال اپنی انتہا کو پہنچ کر روبہ زوال تھا۔ کچھ عرصے کے بعد وہ بلند اقبالی کلہوڑا خاندان کے شہزادوں کی طرف رجوع ہو گئی تھی۔ جاگیرداری، زمینداری اور پیری مریدی اس دور کے سماجی عوامل تھے۔ جاگیرداری کے مستحق وہ لوگ ہوتے ہیں جن کا تعلق یا تو سرکش قبائل سے ہوتا تھا وہ افراد جو فوجی کارناموں کی بدولت اجتماعی زندگی پر حاوی ہو گئے تھے۔ جاگیریں ہر قسم کی محصولات سے متثنیٰ رہیں۔ بالفاظ دیگر ہر جاگیردار اپنے علاقے کا خود مختار فرمان روا ہوتا۔ اس پر اگر برائے نام کسی کی بالدستی تھی تو اس سلطان کی جو تخت دلی پر رونق افروز ہوتا۔ یا کسی قدر اس گورنر کی جو علاقائی طور پر مقرر کیا جاتا۔ جاگیرداروں کی عادات و خصائص ان ہی سانچوں میں ڈھلی ہوئی تھیں، جن کا اطلاق

---

[1]اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ پاکستانی زبانیں، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد
** پی ایچ ڈی اسکالر ، شعبہ پاکستانی زبانیں، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

سلاطین وقت پر ہوتا تھا۔ عالیشان حویلیوں میں رہنا، گھوڑوں اور اونٹوں کا رکھنا، سیر و شکار اور خانگی عیش و عشرت میں وقت صرف کرنا، غریب اور پس ماندہ عوام کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرنا، خوشامدی مصاحبین، جن میں موسیقار، لطیفہ گو، جی حضوری کرنے والے اور اسی قبیلے کے دیگر افراد اپنے گرد جمع رکھنا، ان کی جو لائق طبع سے محضوظ ہونا، اور حسب دلخواہ انعام و اکرام سے نواز دینا، یہ اور اسی قسم کی بہت سی چھوٹی بڑی عیش پسندیوں سے اس دور کا جاگیردارانہ وہم جاگیردارانہ سماج عبارت تھا۔ جاگیرداروں کے علاوہ وہ زمیندار بھی تھے، جن کو زمین کچھ معاوضے پر دی جاتی۔ یہ معاوضہ سالانہ مال گذاری کے طور پر لیا جاتا۔

گندا جنين جي گوڏ ۾ پاپوڙا پوشاڪ

انهن جي اوطاق راجا ريجهي آيو

ترجمہ: جن کے ٹوکرے کندے اور جن کی چھابڑیاں خراب اور گندی ہیں، جن کے کپڑوں سے بھی دامن لگ جائے تو بُرا محسوس ہو، جام سمہ ان لوگوں کے ناز برداشت کر رہا ہے۔

اس شعر میں شاہ عبداللطیف بھٹائی انسان کی عظمت اور انکساری کے حوالے سے کہتے ہیں جن کے پاس لباس پورا نہیں بھی ہو مگر ان کے پاس محبت اور خلوص ہے تو بڑے بڑے بادشاہ بھی ان کے دروازے پر سلامی کرتے ہیں۔

چوتھی صدی ہجری سے بعد کی چند صدیوں تک جو سادات کرام سندھ میں آئے۔ ان کی حیثیت اولیائے کرام اور بزرگان دین کی تھی، لیکن بعد کو اعتداد زمانہ یا بالفاظ دیگر سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کی وجہ سے بیشتر سیدوں میں رفتہ رفتہ وہ روحانیت کم ہو گئی جس کے لیے انہیں واجب الاحترام سمجھا جاتا تھا۔ عوام الناس ان کی رسمی دینداری کے بدستور گرویدہ رہے، لیکن وہ اعلیٰ خوبیاں جن کے لیے انہیں پیر و مرشد تسلیم کیا جاتا تھا، دنیاوی حرص و ہوس کا روپ دھارنے لگیں یا حصول عیش اور سطحی نام و نمود کا ذریعہ بن گئیں۔

سندھ کے دیہی علاقوں کے پس ماندہ عوام سماجی طور پر طرح طرح کی مجبوریوں کاشکار تھے، لیکن پھر بھی مذہبی اقدار کا ان کو اتنا لحاظ تھا کہ روایتی طور پر ان تمام رسم و رواج کی پابندی کرتے تھے، جو ان کے آباؤ اجداد سے انہیں ورثے میں ملے تھے یا ان کے پیر و مرشد نے انہیں سکھائے تھے۔ مثلاً شرعی فرائض کے علاوہ مزاروں پر پھولوں اور موتیوں کی چادریں چڑھانا، پیر کے ہر حکم کو تہہ دل سے ماننا، دعا، تعویذ اور نذر و نیاز کی برکتوں پر ایمان رکھنا، نیز ہر قسم کی صعوبتیں محض اس لئے گوار کر لینا کہ ان کے خلاف کوئی آواز اٹھانا پیر و مرشد کے ناخوش کرنے کے مصداق ہے۔

تجارت زیادہ تر ہندوؤں کے لیے مخصوص تھی، دیہی علاقوں کی چھوٹی چھوٹی دکانوں سے لے کر شہر کی بڑی بڑی دکانوں تک وہ بڑے سلیقے اور میل ملاپ سے کاروباری فرائض انجام دیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ سندھ کے تجارتی ترقی پر ان کا قبضہ رہا۔ ہندوؤں کے مذہبی، معاشرتی رسم و رواج مسلمانوں سے کافی حد تک مختلف تھے۔ تاہم سندھ کے ہندوؤں کی یہ ایک نمایاں خصوصیت تھی کہ وہ برصغیر کے دوسرے علاقوں کے ہندوؤں کی طرح چھوت چھات کے اتنے قائل نہ تھے اور مسلمانوں کے ساتھ ان کا برتاؤ کافی حد تک رواداری پر مبنی تھی مسلمان پیروں فقیروں سے انہیں کچھ ایسی ہی عقیدت تھی جیسی مسلمانوں کو، ساتھ ہی وہ ان سادھوؤں، بھگتوں اور ملنگوں سے بھی بہت زیادہ عقیدت رکھتے تھے جو شمالی ہند اور دوسرے دور دراز علاقوں سے سندھ میں آیا کرتے تھے۔ شاید اسی وجہ سے جوگ اور بھگتی وغیرہ کی تحریکیں سندھ میں کافی مقبول ہوئیں۔

سندھ کی قدیم سماجی زندگی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس پر "بدھ مذہب" کا اثر و نفوذ کچھ اتنا زیادہ تھا کہ صدیوں تک سماجی عوامل کی اساس بودھ مذہب ہی کی تعلیمات پر رہی۔ بدھ مت کے بعد کی مذہبی تحریکوں کا اثر سندھ نے کچھ کم ہی قبول کیا ہے۔ البتہ اسلامی تعلیمات کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ سندھ نے نہ صرف برصغیر میں انہیں سب سے پہلے اپنایا بلکہ ترقی و ترویج میں بھی نمایاں حصہ لیا۔

سندھ میں صوفیائے کرام کی آمد اور ان کی مقبولیت کا اندازہ کرنے کے لیے یہی بات کافی

ہے کہ سندھ میں تصوف کا عمل دخل کچھ اس طرح رہا ہے کہ دیہی علاقوں کے سادہ لوح محنت کشوں سے لے کر اونچی حویلیوں میں رہنے والوں تک نے اسے تہہ دل سے قبول کیا۔ اس قبولیت میں ہندو، مسلمان برابر کے شریک تھے، فرق صرف اتنا تھا کہ ہندو اسے اپنے مذہبی اقدار کے مطابق اسے اپنانا چاہتے تھے۔ عبادت و ریاضت کے علاوہ زندگی کے اور تمام شعبوں میں ہندو اور مسلمانوں میں کوئی ایسا نظریاتی فرق و امتیاز نہ تھا جو کسی قسم کے مذہبی تعصب کو ہوا دے۔ شاید اسی وجہ سے ڈاکٹر برنس نے سندھ کے متعلق کہا تھا۔

"There is no country in Asia or rather on earth that is so perfectly priest ridden."(2)

جیسا کہ شاہ صاحب نے اپنے کلام میں مختلف پیشوں کا ذکر کیا ہے۔ ان افراد اور ان کی پیشہ ورانہ محنت و مشقت سے شاہ نے روحانی رموز و نکات کے طور پر جو کام لیا ہے، اس سے قطع نظر ایک بڑی کام کی بات یہ بھی ہے کہ اس دور کے معاشرتی عوامل کا بہت کچھ علم ہو جاتا ہے مثلاً بھری مسافروں، ملاحوں اور ماہی گیروں سے تعلق رکھنے والی بادبانی کشتیوں اور ان کشتیوں کے مختلف حصوں جسے چپو، رسیاں، کیلے، بادبان وغیرہ کا استعمال بحری مسافروں اور ملاحوں کے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے ان کے گھر والوں کی منت و سماجت، پھر واپسی تک انتظار کی بے چینی، واپس آنے کے بعد گھروالوں کی خوشی، مختلف طریقوں سے اس خوشی کا اظہار، لیکن ساتھ ہی یہ فکر بھی کہ انہیں دوبارہ سفر پر روانہ ہونا ہے۔ ان لوہاروں کی پیشہ وارانہ مصروفیات جو کسانوں اور دوسرے محنت کشوں کے لئے مختلف اوزار بنایا کرتے تھے۔ ان چرخاکاتنے والیوں، کپڑا بننے والوں اور سوت کا کاروبار کرنے والوں کی کاروباری اور نجی زندگیوں کا عکس جو سندھ کی محدود زرعی معیشت اور سندھی معاشرت میں شامل تھے۔ ان خانہ بدوش چرواہوں اور کاشتکاروں کی چھوپنڑوں میں بسر ہونے والی زندگی جو بے سر و سامانی اور خشک سالی کے زمانے میں بھی ہمت نہ ہارتے تھے، ہر قسم کی مصیبتوں کو ہنستے کھیلتے برداشت کرتے رہتے تھے، برسات ہونے سے پہلے ان کی پر امید دعائیں اور برسات کے بعد امنگوں، آرزوؤں اور فطری مسرتوں کا جوش جو سارے دکھ درد دور کر دیتا تھا۔ ان گداگروں اور سیلانی موسیقاروں کی زندگی کا حال جو بستی بستی گھومتے پھرتے، ان سادھوں، سنیاسیوں، جوگیوں اور ملنگوں وغیرہ کا بیان جو بستیوں سے دور بیابانوں میں دھونیاں مارکے، بھبھوت ملتے، سنکھ بجاتے اور مختلف تیرتھوں کی طرف رواں دواں رہتے ان قلندروں، ملنگوں، فقیروں اور مستوں کا نمائشی پندار جو سادہ لوح عوام کو اپنی عجیب وغریب ہرکات سے متاثر کر لیتے تھے۔ اور اس طرح ان کی ضفیف الاعتقادی سے ناجائزہ فائدہ اٹھاتے رہتے تھے، ان مرشدوں، پیروں اور خطرسیدہ بزرگوں کا احترام جو دنیاوی حرص و ہوا سے بے نیاز ہو کر علم و عرفان کی تلقین کرتے اور اپنے عقیدت مندوں کو اعلیٰ اخلاقی اصولوں کی تعلیم دیتے۔ شاہ نے جن عشقیہ داستانوں کو منظوم کیا ہے، ان سے وادی سندھ کی سماجی زندگی کے بہت سے نمایاں پہلو ظاہر ہوتے ہیں۔ مثلاً سسی پنوں کی کہانی میں سندھ اور بلوچستان کے علاقوں میں تیز رفتار اونٹوں سفر پر کرنے والے کارواں اور ان کی منزلیں، اونٹوں کی سجاوٹ اور سار بانوں کی وضع قطع، خشک وتر اور دوسرے تجارتی سامان جن کی تجارت کے لئے بلوچستان کے پہاڑی علاقوں کے تاجر سندھ میں آیا کرتے تھے، نوری و جام تماچی کی داستان میں ایک حکمران طبقے کی جاہ و حشمت کا عکس اور دوسری طرف غریب ماہی گیروں کی پس ماندہ اور مفلسی والی زندگی کی مختلف تصویریں تک کا سماجی پس منظر اجاگر ہوتا ہے۔

تون سمون، آءُ گندري مون ۾ عيب اپار
پسي لي لغار، متان مان ڳر مڻين

ترجمہ: تم سمہ حکمران ہو دوسری طرف میں ایک غریب مچھیرنِ، مجھ میں ہزاروں عیب ہیں،
ایسا نہ ہو کہ تم رانیوں کے خوبصورت چہرے دیکھ کر مجھے بھول جاؤ۔

شاہ نے اپنے کلام میں سندھ کے جن سماجی عوامل کی عکاسی کی ہے ان کے لیے انہیں زیادہ تر اپنے مشاہدات پر بھروسہ کرنا پڑا علاوہ ازیں انہوں نے کچھ مواد سابق داستانوناور دیگر ثقافتی روایات سے بھی حاصل کیا۔ اس لحاظ سے شاہ ایک ایسے آفاقی نظام حیات کے داعی ہیں جو کسی خاص خطہ زمین تک محدود نہ ہو۔

سیاسی پس منظر

دنیا کے ہر عظیم شاعر کی طرح شاہ عبداللطیف بھٹائی نہ صرف اپنے دور کے درد کے شاعر تھے، بلکہ ماضی کے دکھوں کے بھی شاعر تھے۔ ماضی میں اور ماضی کے ماضی میں، اس سرزمین جسے سندھ کہا جاتا ہے اور انگریزی کے شاعر شیلے کے الفاظ میں آنسوں کی وادی Valley of Tears کہتے ہیں جو بھی مظالم ڈھائے گئے ان کے درد کو شاہ صاحب نے اپنی شاعری میں سمیٹا اور اپنی دھرتی کے لوگوں میں ان مظالم کو صبر سے برداشت کرنے کی بجائے ان میں ظلم و استبداد کے خلاف مزاحمت کرنے کی قوت اور حوصلہ پیدا کیا، مثلاً وہ ملاحوں سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ

بندرگاہ پر بڑا ہی خوف و حراص ہے۔ اے ملاحوؑ تم آرام سے مت بیٹھو۔ زرا دیکھو، کنارہ یوں بھنور بنا رہا ہے جیسے مٹکے میں دہی بلوئی جاتی ہے اے کشتی بانوؑ اس قدر دکھ درد سہنے کے بعد تمہیں سونا نہیں چاہیے۔

بندر جان پئي، تان سُکاٹيا مَ سُمهو
ڪپر ٿو ڪنُ ڪري، جئن ماٽي منجھ مهي
ايڏو سُور سهي، ننڊر نو ڪجاءُ ناڪئا!

واقعہ کربلا کے حوالے سے اپنے لوگوں کو مخاطب ہو کر فرماتے ہیں: اے جانباز! اگر تو فتح چاہتا ہے تو دل سے زندہ رہنے کے سارے وسوسے نکال دے بھالے مار، دست و بازو سے مڑ، وار کو روکنے کے لیے ڈھال کو آڑے مت کر، اپنے اوپر تلوار کے وار لے تو بہادر کہلائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کے سندھ ہمیشہ بیرونی حملہ آوروں کی آماجگاہ رہا ہے۔ آریوں نے سندھ کی موہن جو دڑو کی تہذیب کو روندا اور پھر وحشی قبائل کے حملوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ 515ق م میں ایران کے حکمران دارائے اعظم نے سندھ پر حملہ کیا اور سندھ کو [3]ایران میں شامل کر لیا اور ہر سال وہ سندھ سے 260 من سونا خراج میں لیتا تھا۔ دارائے اعظم اور سکندر اعظم کی جنگ میں سندھی جانبازوں نے اپنی تیغ زنی کے جوہر دکھائے، دارا کو شکست دینے کے بعد سکندر اعظم، افغانستان کے بعد موجودہ صوبہ سرحد اور پنجاب کو فتح کرتا ہوا وہ جب سندھ پہنچا تو اس وقت سندھ کے تین حکمران تھے۔ سکندر کے مورخین نے ان کے اور ان کے علاقوں کے نام کہ جن پر وہ حکومت کرتے تھے۔ درج ذیل بتائیں ہیں:

1. میکسی کینس الور کا حکمران
2. آکسی کینس وسطی سندھ کا حکمران
3. سامبس سیوہن کا حکمران[4]

ان تین حکمرانوں کو شکست دینے اور ہزاروں بیگناہ لوگوں کو قتل کرنے کے بعد وہ پاتال بندر پہنچا جس کے لیے کہا جاتا ہے کہ وہ موجودہ ٹھٹہ کے قریب تھا۔ پاتال بندر میں سندھیوں نے اس سے چھاپہ مار جنگ کی اور یہاں بھی اس نے ہزاروں لوگوں کو تہہ تیغ کیا لسبیلہ کے راستے سے کرمان روانہ ہوا، اس کا سندھ سے گذر کسی طرح بھی قیامت سے کم نہ تھا، تاریخی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ سکندر اعظم کے حملے کے وقت الوکار کا حکمران رائے گھرانے سے تھا، جسے سکندر کے تاریخ نویسوں نے میکسی کینس لکھا ہے لیکن سکندر کے بعد رائے گھرانے کا تاریخ میں کوئی ذکر نہیں ملتا اور پھر اچانک عربوں کے سندھ پر حملے سے پہلے رائے گھرانے کے مندرجہ ذیل پانچ حکمران کا تذکرہ ملتا ہے۔

1.رائے دیوائچ 2.رائے سیھرس اول 3. رائے سیھرس ثانی
4. رائے سہاسی اول 5. رائے سہاسی ثانی [5]

رائے گھرانے کا دور سندھ کی خوشحالی کا دور تھا زیادہ تر لوگ بدھ مت اور جین مت کے پیروکار تھے، امن، سکون اور خوشحالی کے اس منظر نامے میں اچانک ایک چالاک برہمن داخل ہوا جس کا نام چچ بن سلائج تھا۔ اس نے کسی طرح رائے سیاسی ثانی کے دربار میں رسائی حاصل کی اور رائے سہاسی ثانی کی رانی سونھن دیوی سے گٹھ جوڑ کرکے حکومت پر قبضہ کر لیا۔

شاہ صاحب کا عہد 1689ء تا 1752ء

تاریخ کی یہ ساری صعوبتیں اور اذیتیں جو مختلف ادوار میں سندھ کی دھرتی سہتی رہی تھی وہ ساری کی ساری، شاہ صاحب کے کلام میں سمٹ آئیں۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے سندھ کی تاریخ کے بیشمار اتار چڑھاؤ دیکھے۔ سیاسی، معاشرتی اور معاشی ابتری دیکھی۔ تاریخ کے دیے ہوئے زخموں کو ٹٹولا، اور اپنی شاعری سے اس سر زمین کے باسیوں میں نئی روح پھونکی۔ اس کے لیے انہوں نے عوامی زبان اور لہجے کا انتخاب کیا اور ان کی نفسیات کے پیش نظر سندھ کی لوک داستانوں کو تمثیل کا رنگ دے کر اپنا پیغام ان تک پہنچایا۔ مثلاً سُر مارئی" میں آپ نے ایک کمزور نادار اور بے سہارا لڑکی کے پہاڑ سے بھی بلند اور اٹل ارادے دکھائے ہیں وہ نادار لڑکی خود اعتمادی، وطن پرستی اور عصمت پروری کی علامت ہے اور رہتی دھرتی کی مٹی سے اپنی زندگی کی انسیت اور وارفتگی و خدائیت کا مثالی نمونہ پیش کیا۔ "سُر گھاتو" میں جرائت اور مردانگی کا سبق دیتے ہیں۔ "سُر سارنگ" میں اپنے دیس کے موسموں اور زمین کی خوشبوؤں سے پیار کرنا سکھاتے ہیں تو دوسری طرف سُر کھاہوڑی اور سُر رام کلی میں منزل کی لگن اور جستجو کا درس دیتے ہیں سُر سسئی، مومل رانو، سوہنی اور لیلا چنیسر میں بتاتے ہیں کہ انسان کو اپنی منزل تک پہنچنے کے لئے کیا کیا قربانیاں دینی پڑتی ہیں اور راہ میں کیا کیا مصیبتیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ کس طرح مقصد کے حصول کے لیے دشت و جبل بھٹکنا پڑتا ہے وقتی طور پر انسان ناکامیوں سے بھی دو چار ہوتا ہے۔ لیکن مسلسل جستجو سے وہ بالا آخر اپنی منزل پا لیتا ہے۔ جبکہ سُر کلیان اور یمن کلیان میں خالق حقیقی اور اس کے محبوب کی نشانیاں بیان کی ہے اور اپنے نظریہ وحدت الوجود کی شاعرانہ تشریح کی ہے اس طرح شاہ صاحب نے خدا پرستی و انسان دوستی کے سنگم سے زندگی کے ہر پہلو کو شاعری میں ڈھالا ہے۔

هو چونئي تون مَ چو وتان ورائي
اڳ اڳرائي جو ڪري خطا سو کائي

شاہ کی شاعری کی مقبولیت کا ایک سبب یہ ہے کہ ان کی شاعری مذہب اور رنگ و نسل کی تفریق اور تعصب سے بلند تر ہے، ان کی شاعری گو کہ ایک خاص علاقے کی زبان میں ضرور ہے لیکن اس میں استوار آفاقیت اور ہمہ گیریت ہے کہ وہ پوری انسانیت کی شاعری ہے۔[6]

ان کا کلام بنیاد پرستی کی نفی کرتا ہے اور وحدت انسانیت کے اقدار کو فروغ بخشتا ہے۔ ان کے کلام میں ایسے کردار ہیں جو غیر مسلم ہیں، رائے ڈیاچ ہندو راجا تھا، لاکھو پھلانی کچھ کا ہندو تھا، رانو سوھڑ تھر کا راجپوت تھا، مومل ہندو لڑکی تھی، سسئی بھی ہندو قوم سے تعلق رکھتی تھی، ان کرداروں کے علاوہ اوڑ، جاڑی، ریباری، جوگی، سنیاسی اور آدیسی سب کے سب غیر مسلم تھے۔ اور ان سب کو شاہ صاحب نے اپنی شاعری میں شامل کرکے انسانی مساوات اور وحدت انسانیت کے اقدار کی آبیاری کی ہے۔ اس دور میں سخت گیر علماء کی طرف سے مذہبی عدم رواداری کا ماحول پیدا کرنے کی کوشش ہوتی رہیں لیکن سندھ کے صوفی وحدت الوجودی بزرگوں نے ہمیشہ ان کوششوں کی حوصلہ شکنی کی۔ سخت بنیاد پرستی کے اس دور میں شاہ صاحب نے مذہبی رواداری انسان دوستی اور امن و آشتی کا پیغام دیا۔ یہی اسلام کا پیغا م ہے۔ شاہ صاحب نے اپنے صوفیانہ نظریہ، ہمہ اوست کے حوالے سے اس طرح کا فرمان جاری کرنے والے مغلوں کو مخاطب ہو کر کہا۔

بحر و بر اور شجر سب میں سے ایک ہی صدا آ رہی ہے۔ یہ سب سزا کے سزاوار ہیں۔

یہ تمام کے تمام منصور ہیں بتا اے قاضی تو کس کس کو سولی پر چڑھائے گااس طرح ان کا سارا کلام فرقہ واریت اور تنگ نظری کے خلاف للکار اور وحدت انسانیت کی پکار ہے یہی وجہ ہے کہ برصغیر کی پوری تاریخ میں غیر مسلموں نے صوفیاء کرام کو اپنا نجات دہندہ سمجھا اور آج بھی ان کی مزارات پر غیر مسلموں کا جم غفیر رہتا ہے شاہ صاحب کی اس مذہبی رواداری کی وجہ سے ہندو ان کے کلام کو اپنا مقدس مذہبی کلام مانتے ہیں۔ اور ہندو محققین نے ان کے کلام کی تحقیق، ترتیب و ترویج میں بڑا کام کیا ہے۔

اکثر شعراء کا کلام وقتی طور پر شہرت پاتا ہے اور پھر وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ماضی کی دھول میں غائب ہو جاتا ہے لیکن شاہ صاحب کا کلام جس طرح ماضی میں مقبول تھا، اسی طرح

آج بھی مقبول ہے بلکہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اس کی مزید خوبصورتی کِھل رہی ہیں اور مستقبل میں اور اہمیت حاصل کرتا جائے گا۔ اس لیے میں نے شاہ صاحب کوماضی، حال اور مستقبل کا شاعر کہا ہے۔

صوفیاء کرام کے نزدیک ہر انسان چاہیے اس کا مذہب، مسلک، نسل کوئی بھی ہو، اس کا کسی بھی سماجی طبقے سے تعلق ہو، تمام انسان اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہیں شاہ صاحب فرماتے ہیں:

ایک قصر در لک، کوڑین کٹس گڑکیون
جیڈانھن کریان پرک، تیڈانھن صاحب سامھون

"اے میرے محبوب! تیرے لاکھوں کروڑوں صورتیں ہیں۔ سب کے جی ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں لیکن دیدار الگ الگ ہے۔ اے میرے محبوب!میں تیری کیا کیا نشانیاں بیان کروں۔"(7)

مشہور مفکر کا قول ہے "اخلاقیات کمزور لوگوں کی پیدا کردہ صفت ہے طاقتور کو کسی اخلاقی قدر کی ضرورت نہیں۔ طاقتور کو حق حاصل ہے کہ وہ طاقت کے بل پر جو چاہے کرتا رہے۔"

آج تک کوئی ایسا فلاسفر نہیں گذرا، جس نے ایک عام انسان کی اسطرح عظمت بیان کی ہو جس طرح کہ صوفیا کرام نے کی ہے۔ نفرت نے انسان کو طبقوں اور قومیتوں میں بانٹا۔ ان کی اسطرح کی فکر کے نتیجے میں دو عالمی جنگیں لڑی گئیں اور انسانوں کو کیڑوں مکوڑوں کی طرح مارا گیا اور ہنستے بستے شہروں پر ایٹم بم برسا کر انہیں خاکستر کر دیا گیا۔ ان کے مقابلے میں شاہ صاحب "میں" اور "تو" کا فاصلہ مٹا کر کہتا ہے:

پائے کان کمان میں، میاں مار نہ موں،
موں میں آہیں توں، متاں تہنجو ئی تو کھے لگے(8)

اے میرے محبوب مجھ پر اپنا تیر نہ چلا، کیونکہ تو مجھ میں موجد ہے، کہیں تیرا تیر تجھے ہی گھائل نہ کردے۔

شاہ صاحب کے نزدیک ہر جز ایک کل کا حصہ ہے اور اپنی نفی میں اپنا اثبات ہے ہر انسان جب اس کل کا جز ہے تو پھر ذات پرستی اور خود پرستی اور خود غرضی کیسی؟ کینہ، حسد، تعصب اور نفرت کیسی؟ اس آفاقیت کا اظہار شاہ صاحب نے یوں کیا ہے۔

سائیں سدائیں کریں متھے سندھ سُکار،
دوست مٹھا دلدار عالم سبھ آباد کریں

اے مالک! سندھ کو ہمیشہ خوشحال رکھ
اےمیرے دوست اے دلدار! سارے عالم کو آباد رکھ(9)

شاہ صاحب کا انسانی فطرت کا مشاہدہ گہرا ہے وہ انسانی نفسیات کو سمجھتے ہیں اور اپنے اسی تجربے اور مشاہدے کو بروئےکار لاتے ہوئے، انسان کو برائی کے راستے سے بھلا ئی کے راستے پر چلنے کی تلقین کرتے ہیں۔

شاہ صاحب انسان کی فطری ضرورتوں کے منکر نہیں، وہ ترک دنیا کا درس نہیں دیتے لیکن یہ درس ضرور دیتے ہیں کہ انسان اپنی خواہشوں کو محدود کر دے تو سُکھ اور چین سے جی سکتا ہے۔ ان کے نزدیک تھر کا باشندہ ایک مثالی انسان ہے جو زندگی سے مایوس نہیں ہوتا۔ جو کچھ بھی میسر ہو اس پر گذارا کرتا ہے وہ کوئی ایسی خواہش نہیں کرتا کہ جو پوری نہ ہو سکے اس لیے احساس کمتری میں بھی مبتلا نہیں رہتا۔ اپنی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے اصولوں کے سودے بازی نہیں کرتا۔ مفلسی اور ناداری، بھوک اور پیاس میں بڑے وقار سے جیتا ہے تھر کا سماج محبتوں کا سماج ہے اور ہر انسان، دوسرے کا دُکھ سُکھ بانٹتا ہے اپنے مفاد کے خاطر دوسرے کو نقصان نہیں دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ تھر میں رہنے والے کو گھر کے لیے دروازہ کی ضرورت نہیں کہ جسے وہ دوسروں پر بند کر دے۔ شاہ صاحب کے لیے یہ انسان ایک مثالی انسان ہے۔

حوالہ جات

1. سُورلے ایچ ڈی آر، ڈاکٹر، رسالہ شاہ عبداللطیف، مترجم شیخ ایاز، کراچی، سندھیکا اکیڈمی، 2009، ص 98
2. برنس، ڈاکٹر، مشمولہ، رسالہ شاہ عبداللطیف، مترجم شیخ ایاز، کراچی، سندھیکا اکیڈمی، 1991ء، ص 17
3. بھیرو مل آڈوانی، قدیم سندھ، کراچی، سندھی ادبی بورڈ، ایڈیشن 2، 1957ء، ص 106
4. منظور احمد قناصرو، شاہ عبداللطیف بھٹائی، حیات و افکار، کراچی، سندھیکا اکیڈمی، 2009ء، ص 98
5. ایضاً، ص 98
6. سید مظہر جمیل، جدید سندھی ادب، کراچی، اکادمی بازیافت، 2007ء، ص 426
7. منظور احمد قناصرو، شاہ عبداللطیف بھٹائی، حیات و افکار، کراچی، سندھیکا اکیڈمی، 2009ء، ص 169
8. ایضاً، ص 213
9. ایاز حسین قادری، ڈاکٹر، کلام شاہ عبداللطیف بھٹائی، اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان،جلد سوم، 1993ء، ص655

نوٹ: سندھی کے تمام ابیات "شاہ جو رسالو" مرتب ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ کے جلد نمبر 8 ویں اور 9 ویں سے دیے گئے ہیں۔